ہے.. تمہارے اور میرے درمیان یہی رابطہ ہے.. موت کے سوا اور کوئی تعلق نہیں.. مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی کہ یہ کیوں آجاتی ہے اور کوئی ایک لمحہ کیوں چُنتی ہے آنے کے لیے.. کوئی دوسرا کیوں نہیں.. اور کسی ایک فرد کو کیوں چُنتی ہے.. میں بس یہی جاننے کی آرزومند ہوں.. شاید تم اس گتھی کو سلجھا سکو.. تم جو مجھے موت کے رسیا لگے ہو۔"

پرائی آنکھوں سے پوشیدہ مرگلہ کی پہاڑیوں کے اندر جو ایک ندی بہہ رہی ہے اس پر ایک پل ہے جس پر ایک سفید کار کھڑی ہے..

سٹیئرنگ سے اوپر عقبی ٹریفک پر نظر رکھنے والا جو آئینہ ہے اس کے گلے میں موتیے کا بوسیدہ.. اپنے کنوارپن کی سفیدی کھو کر دُھندلا جانے والا ایک ہار لٹک رہا ہے جس کی مہک میں ناگواری کا زوال ہے..

پُل پر سے مرگلہ کے کسی گاؤں تک جاتی کوئی ویگن کبھی کبھار گزرتی ہے اور سفید کار کو سامنے پا کر ہارن دے کر گزرتی ہے..

کوئی خاندان.. اسلام آباد یا پیر سہاوے سے لوٹتا.. پہاڑی سے اتر کر پُل کے پار اپنے گاؤں کو جاتا ہوا..

وہ ویگن اور اور وہ خاندان دونوں.. ان کی موجودگی سے بے خبر.. وہ جو پُل سے ذرا فاصلے پر پانیوں کے قریب ہوئے بیٹھے ہیں.. دور سے یہی لگتا ہے کہ ایک مدت سے ایک دوسرے سے آشنا ہیں۔ تنہائی کی چاہت میں ادھر آنکلے ہیں اور اب جانے کیا راز و نیاز کر رہے ہیں.. لیکن کوئی بھی ان کی طرف دھیان نہیں کرتا تھا.. اسی لیے کوئی بھی اس امر سے آگاہ نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے سراسر اجنبی ہیں اور.. صرف موت ہے جو ان کو یہاں لے آئی ہے۔

"مجھے بتاؤ کہ یہ عشق کیا ہے اور مرگ کیا ہے.. ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے.. تمہاری ایک کہانی "پریم" میں یہی شائبے اور یہی سائے ہیں... تمہاری ہر تحریر میں کہیں نہ کہیں سے موت داخل ہو جاتی ہے اور کم از کم میرے لیے مرکزی کردار بن جاتی ہے.. ایسا کیوں ہے؟ کیا تم نے اس کا تجربہ کیا ہے.. اس کا ذائقہ چکھا ہے.. یا اس کے اتنے نزدیک گئے ہو کہ تم نے اس کے پار جو کچھ ہے اسے دیکھ لیا ہے.. تم ہمیشہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہو.. اس کی تمنا کرتے ہو یا اس سے اتنے خوفزدہ ہو کہ حواس کھو چکے ہو.. تمہاری ہر سطر میں

موت در آتی ہے۔ میں اس کے سیاہ بھنور کے گرداب میں ہوں.. میں اس کا جواز نہیں سمجھ سکتی.. تم سمجھا سکتے ہو کہ یہ کیا ہے...“

پیر سہاوہ کے دے سائڈ عارضی چائے خانوں سے ذرا آگے ایک کچی پتھریلی سڑک نیچے اترتی ہے۔ نیچے مرگلہ کے نشیب میں.. بادی النظر میں یہ سڑک ایسی نہیں لگتی کہ اس پر کوئی عام کار آسانی سے اترے.. عارضی چائے خانے مرگلہ کی ڈھلوان سے ذرا ادھر پکنک کے لیے آنے والے اسلام آبادی کراوڈ سے بھرے پڑے تھے.. سرکاری اور ذاتی.. پاش اور مہنگی کاریں اور کوسٹر سڑک کے کناروں پر ادھر ادھر بے ترتیبی سے پارک کیے گئے تھے.. بے جا شوخی سے کلبلاتی خواتین اور چیختے چلاتے بچے اور ان کے تھکے ہوئے اور بیزار خاوند اور باپ شکستہ کرسیوں پر اپنے آپ کو سنبھالتے پیر سہاوا کی بلندی سے نیچے نظر آنے والے' دھندلاتے ہوئے شہر میں اپنے سیکٹر اپنی گلیاں اور اپنے مکان تلاش کرتے تھے.. اپنے مکان کے نواح میں کسی اہم اور بڑی عمارت کو سپاٹ کر کے اس کی جانب انگلی سیدھی کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی نہ نظر آنے والی گلی کا تعین کرتے تھے اور پھر اسے کھو دیتے تھے اور یوں دھندلاتے ہوئے شہر کے نقشے میں بھٹکتے پھرتے تھے۔

پیر سہاوا کے ہالی ڈے کراوڈ کی دوسری تفریح یہ تھی کہ وہ دامنِ کوہ سے آنے والی ہر کار اور جیپ کو نظر میں رکھتے تھے اور اس میں سوار لوگوں کی زندگیوں میں جھانکتے تھے.. خاور نے اس ہجوم کے قریب رکنے کی بجائے ذرا آگے جا کر کار کو دائیں ہاتھ پر اس سڑک پر اتار دیا جو کچی اور پتھریلی تھی اور یکدم آس پاس کے منظر کو اوجھل کر کے نیچے چلی جاتی تھی۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ نیچے مرگلہ کی پہاڑیوں کے اندر نشیب میں کیا ہے اور سڑک اسے کہاں لے جائے گی۔ وہ کار کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کے گیئر بڑی مشقت سے اور جھنجھلاہٹ میں بدلتا تھا کہ اسے اس کی عادت نہ تھی۔ اس کی اپنی کار بہت دنوں سے ورکشاپ میں کھلی پڑی تھی کیونکہ اس کا گیئر بوکس ناکارہ ہو چکا تھا اور یہ کار ایک دوست سے حاصل کی گئی تھی۔ کسی دوسرے شخص کی کار کو ڈرائیو کرنا ایسے ہی جیسے کسی اجنبی کے بستر میں سونا' اگرچہ کمبل چادر یا تکیہ تو وہی ہوتے ہیں لیکن آپ بے آرام ہوتے رہتے ہیں.. بہر طور یہ ادھار کی گاڑی اٹکتی ہوئی' پتھروں سے ٹکراتی.. کبھی اس کے بس سے باہر ہوتی اور کبھی قابو میں آتی اپنی

مرضی کی رفتار سے نیچے اترتی گئی اور جب گاڑی دھچکوں سے تقریباً بے قابو ہوتی نشیب میں گرتی چلی جاتی تھی تو اسے احساس ہوا کہ بیک ویو مرر کے ساتھ ایک بوسیدہ مرجھایا ہوا موتیے کے پھولوں کا ہار لٹکا ہوا ہے جو ہر جھٹکے کے ساتھ جھولتا ہے تو اس کی ناک کے قریب آتا ہے اور اس میں سے زوال کی بو آتی ہے.. جیسے اولڈ پیپل ہوم میں صرف دوائیوں اور ٹیکوں کے سہارے زندہ رہنے والے بوڑھوں کے گوشت میں سے آتی ہے۔

ڈھلوان کا اختتام ہوا تو ایک ندی کہیں سے نمودار ہوئی اور ان کے سامنے ونڈ سکرین کے پار بہنے لگی.. اس پر ایک پل تھا..

انہیں اس پل سے ذرا فاصلے پر ندی کے کنارے کے پتھروں پر بیٹھے ایک عرصہ ہو گیا تھا..

اتنا عرصہ کہ وہ پل جس پر سفید کار کھڑی تھی اور اس میں زوال کی بُو والا ہار لٹکتا تھا .. مرگلہ کی یہ اُس کے لیے بے نام ندی اور اس کے کناروں پر سر اٹھانے والے پتھریلے جھاڑیوں سے اٹے پہاڑ ساکت ہو کر ایک تصویر میں بدل چکے تھے.. زمانے بہت بیت گئے تھے۔ مدتیں گزر چکی تھیں۔ صرف پانیوں کے اوپر لشکتی کرنیں اس ٹھہراؤ کو اپنے زور سے توڑتی تھیں.. پوری تصویر کو نہیں صرف اس کے ایک حصے کو جس میں بہاؤ کا تسلسل تھمتا نہ تھا۔ وہ اپنی نشست کو ذرا بہتر کرنے کے لیے ہتھیلیاں پتھر پر جما کر ذرا کھسکتی تو اجرک سے بنی ہوئی اس کی شلوار کے پائینچے بھی ذرا کھسک جاتے اور جاگزر کے اوپر اس کے سفید ٹخنے دکھائی دینے لگتے..

"مجھے تم سے دلچسپی نہیں ہے.. موت میں ہے.. کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟"

کسی بھی کامیاب تخلیقی اور اچھی بُنت کی کہانی میں ہر کردار ایک ہی صورت حال اور ایک ہی رابطے سے سامنے نہیں آتا۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر نیا کردار اپنے خاص پس منظر اور اپنی مخصوص لینڈ سکیپ کے ساتھ مختلف حالات سے کہانی کے اندر داخل ہو.. لیکن زندگی پر آپ کوئی ایسی پابندی لاگو نہیں کر سکتے.. وہ اپنے بہاؤ میں چلی آتی ہے اور کہانی کی پرواہ نہیں کرتی.. اسی لیے سلطانہ بھی اس کی زندگی میں اسی ایک ون وے سٹریٹ میں

سے نمودار ہوئی.. جس میں سے غلافی آنکھیں اور عابدہ سومرو داخل ہوئی تھیں.. ٹیلیفون کی ون وے سٹریٹ میں سے..

حقیقت کو محض چاشنی کی خاطر تو نہیں بدلا جاسکتا..

صرف یکسانیت کو توڑنے کے لیے غیر حقیقی تغیر کی آمیزش تو نہیں کی جاسکتی..

اسی لیے وہی ٹیلی فون تھا..

بارہ کہو کا وہی بل ڈوزر کے بلیڈوں کے خوف سے دبکا ہوا گھر تھا..

"کین آئی سپیک ٹو مسٹر خاور پلیز..." یہ آواز نہ تو جنسی انداز میں گھنی ہوتی تھی اور نہ ہی آنسو بہاتی لرزش میں تھی.. یہ ایک کاروباری انداز کی ٹھنڈی اور براہ راست آواز تھی۔

"سپیکنگ..."

ابتدائی گفتگو ایک سراسر اور شدید امریکی لہجے کی انگریزی میں تھی۔ روانی اور بے پروائی کی کیفیت میں۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں.. اگر یہ ممکن ہو اور آپ برا نہ منائیں تو.."

"کس سلسلے میں؟" اس نے حسب عادت دریافت کیا..

"موت کے سلسلے میں..."

وہ چپ ہو گیا.. بہت دیر تک خاموش رہا اپنے آپ کو باور کروانے کے لیے کہ اس نے یہی کہا تھا کہ.. موت کے سلسلے میں.. یہ کیا جواب ہوا.. ٹیلی فون کا سیاہ چونگا ایک پھنیئر سانپ کی طرح پھیلا ہوا تھا اور وہ اسے ایک خوفزدہ کبوتر کی مانند آنکھیں جھپکے بغیر دیکھے چلا جا رہا تھا۔ یہ کیا جواب ہوا..

"آر یو سٹل دیئر مسٹر خاور.."

"یس آئی ایم..."

"میں نے ایک سادہ سا سوال پوچھا ہے کہ کیا آپ سے ملاقات ممکن ہے؟.. اگر نہیں تو آپ انکار کر سکتے ہیں.."

"آپ کون ہیں؟"

"میں اپنا تعارف کروائے دیتی ہوں.. میرا نام ڈاکٹر سلطانہ شاہ ہے.. میرا تعلق

کوئٹہ سے ہے اور میں اسلام آباد میں ایک کینیڈین این جی او میں کام کرتی ہوں۔۔"

"آپ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں؟"

"نہیں۔۔ میں نے انتھروپولوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے امریکہ سے۔۔ آئی ایم سوری لیکن آپ بہت پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔۔ پاکستان میں تو خواتین سے اتنے سوال نہیں پوچھے جاتے۔۔ میں آپ سے ڈیٹ نہیں مانگ رہی صرف ایک سرسری ملاقات کرنا چاہتی ہوں اپنی ایک الجھن دور کرنے کے لیے۔۔ دیٹس آل۔۔۔"

"آپ مجھے موت کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں۔۔ ڈیتھ؟"

"ہاں۔۔۔"

وہ پھر چپ ہو گیا۔۔ ایسے کرداروں کے ساتھ اس کا سابقہ پڑتا رہتا تھا جو کسی ایک موضوع کے اسیر ہوتے تھے۔۔ خودکشی کی کیا وجوہات ہوتی ہیں۔۔۔۔ تخلیق کا منبع کیا ہے۔۔ کیا یہ زندگی محض ایک حادثہ ہے۔۔۔ اور وہ دن رات اس موضوع کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔ لائبریریوں میں پہروں بیٹھ کر ریسرچ کرتے تھے۔۔ مختلف لوگوں کو۔۔ اس جیسے لوگوں کو طویل سوالنامے بھیجتے تھے اور پھر اس موضوع سے اکتا کر کسی اور طرف نکل جاتے تھے۔۔ لیکن یہ خاتون پی ایچ ڈی کر چکی تھیں، علم الانسان میں۔۔ اور اس علم میں موت سرفہرست تھی۔۔ بشر کی فنا سے تو اس کا آغاز ہوتا تھا۔۔ شاید موت میں اس کی دلچسپی اسی حوالے سے تھی۔۔

"آئی ایم سوری لیکن اس ہفتے تو شاید یہ ممکن نہ ہو سکے۔۔"

"یہ کبھی ممکن ہو سکتا ہے؟"

"ہاں۔۔ آں۔۔۔"

"شاید اگلے ہفتے۔۔۔؟"

"جی۔۔"

"تو آپ اجازت دیں تو میں اگلے ہفتے آپ سے رابطہ کر کے چیک کر سکتی ہوں۔۔ کونسے روز اور کس وقت؟۔۔"

"کسی روز بھی۔۔۔ میں بہت کم گھر سے باہر جاتا ہوں۔"

"تھینک یو۔۔۔"

وہ جہاں کہیں بھی اردو کا سہارا لیتی تھی تو ذرا رک رک کر لفظ چبا چبا کر بولتی تھی اور جب اظہار میں دشواری ہونے لگتی تھی تو امریکی لہجے کی انگریزی میں رواں ہو جاتی تھی اور اس کا اظہار وسیع ہو جاتا تھا۔

اگلی شام بڑے پتھر کی کھوہ سے روپوش آخری چکن اینڈ چیز سینڈوچ کھاتے ہوئے اس نے نہایت سرسری انداز میں اس ٹیلی فون کال کا ذکر کیا..

"آہا... ایک اور کیس... عابدہ سومرو کے بعد ایک اور گرفتار محبت"... اس نے ہنستے ہوئے اپنی غلافی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور وہ واقعی بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ "لیکن یار اولیت تو مجھے حاصل ہے اس لیے مجھے فوقیت دینا.. اب تو ماشاءاللہ رونق ہو گئی ہے.. اور تم یقین نہیں کرتے تھے کہ عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا.."

"تمہارا تو ون ٹریک مائنڈ ہے.." خاور نے جھلا کر کہا تھا۔ "ہر کوئی تمہاری طرح پاگل خانہ نہیں ہے.. اس نے انتھروپولوجی میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اور اسے موت کی حقیقت کے بارے میں کوئی الجھن ہے جو وہ مجھ سے مل کر سلجھانا چاہتی ہے.."

"اسے کیا پتہ کہ موت کیا ہے..." اس کا لہجہ.. اس کا رنگ بدلا اور اس نے ایک خاص زہر آلود انداز میں جیسے تھوکتے ہوئے کہا..

خاور کے سامنے وہ بری طرح سرزنے لگی..

"کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں.. لیکن اسے موت کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم... یہ تم اسے میری طرف سے بتا سکتے ہو.. اور تمہیں بھی کچھ نہیں معلوم.. تحریروں میں تم اس کے ساتھ رومانس لڑا سکتے ہو.. بہت گیانی ہو کر اس کی حکمت کو بیان کر سکتے ہو لیکن تمہیں بھی کچھ پتہ نہیں.."

"میں جانتا ہوں.. تم درست کہتی ہو لیکن میں نے کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا.. تو اس میں مجھ سے ناراض ہونے والی کیا بات ہے.."

"آئی ایم سوری.." وہ پھر سے ہنسنے لگی اور فوراً نارمل ہو گئی "میں تھوڑی سی جیلس ہو گئی تھی.."

"جیلسی کی گنجائش تم نے خود نکال لی ہے ورنہ یہ خاتون صرف ایک خالصتاً علمی

حوالے سے مجھے ملنا چاہتی ہے.."

"نہ.." اس نے اپنی انگلی کھڑی کر دی۔ "نہ.."

"کیوں.. نہ.." وہ جھنجھلا گیا..

"علمی حوالوں کے لیے تو لائبریریاں اور بوڑھے سکالر بھرے پڑے ہیں.. یہ محض ایک بہانہ ہے.. دے بیچ از آفٹر یو..."

"تمہاری اطلاع کے لیے میں اگرچہ سکالر نہیں مگر بوڑھے ہونے کی شرط پوری کرتا ہوں۔"

"تم اتنے بوڑھے نہیں ہو.." وہ اسے تنگ کرنے پر تلی ہوئی تھی.. "آئی ایم جیلس"

"تم عابدہ سومرو سے تو کبھی جیلس نہیں ہوئیں.."

"وہ کیس بالکل مختلف نوعیت کا ہے.. ہاں اس ڈاکٹر صاحب کو عابدہ کے ساتھ رابطہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ ہے جو موت کو جانتی ہے.. یہ تمہاری ڈاکٹر شادی شدہ ہے؟"

"کچھ ہوش کے ناخن لو.. یہ میں اس سے کیسے پوچھ سکتا تھا.. اس کا لہجہ بالکل سپاٹ اور کاروباری طرح کا تھا.."

"تو پھر وہ کاروبار کرے گی خاور ڈیئر.. پی ایچ ڈی ان انتھروپولوجی... کیا میں ابھی سے اس کے سراپے کا نقشہ کھینچ دوں.. تم پتہ نہیں کن خیالوں میں ہو.. لیکن وہ اگر شادی شدہ نہیں ہے تو طلاق یافتہ ضرور ہے.. کنواری ہوتی تو یوں بے دھڑک تم سے رابطہ نہ کرتی.. کم از کم پینتالیس برس کی ہے.. یعنی مجھ سے کچھ بڑی.. موٹی ہے... دبیز شیشوں کی عینک لگاتی ہے اور اسے کوئی گھاس نہیں ڈالتا اور وہ تمہیں چرنے آگئی ہے..."

"اس چراگاہ میں چرنے کو کچھ باقی ہی نہیں تو وہ کیا چرنے آگئی ہے؟" وہ اس کے تجزیے سے بے حد محظوظ ہو رہا تھا اور خوشگوار موڈ میں تھا۔

"منہ مارنے آگئی ہے.."

وہ اس سے بے حد پرکشش لگ رہی تھی.. اس کی غلافی آنکھیں بوجھل تتلیوں کی طرح خاور کے بدن کی گھاس پر براجمان ہوتی تھیں.. چند لمحوں کے لیے بوجھ ڈالتی تھیں اور پھر اڑ جاتی تھیں.. ایک اور شام تھی اور بارہ کہو کے دیہات میں اس کی آمد پر کہیں کہیں

بلب روشن ہوتے جاتے تھے.. اس کے رد عمل میں حسد کی جو لہر آئی تھی وہ گزر چکی تھی اور اب اس میں رقابت کا کوئی جذبہ نہ تھا اور وہ اس کی رفاقت میں خوش اور لاپرواہ تھی "پہلے یہ بتاؤ کہ اس سندھی وڈیرن نے تمہارے ساتھ کیا کیا... اس نے بھی منہ مارا کہ نہیں..."

وہ ایک سمجھ میں نہ آنے والا وجود تھا جو پل میں کچھ ہوتا تھا اور پھر کچھ اور...

"میں نے تمہیں بتایا تو ہے... تم بھی اگر تجربہ کر لیتیں تو تم بھی جان جاتیں کہ اس چراگاہ میں تو گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں تو وہ کیسے منہ مار سکتی تھی.."

"پلیز پلیز.." وہ بچوں کی طرح اٹھلاتی ہوئی منہ بسورتی ضد کرنے لگی۔ "مویشی تو اپنی عادت سے مجبور ہوتا ہے.. منہ مارنے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ چراگاہ میں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں۔ کوشش تو کرتا ہے.. پلیز پلیز مجھے بتاؤ.."

خاور نے اس لاپرواہ کیفیت میں.. اس یقین کے ساتھ کہ وہ عابدہ سومرو کے لیے صرف ہمدردی کے جذبات رکھتی ہے اور ان میں رقابت کا ایک ذرہ بھی شامل نہیں.. بارہ کہو کے دیہات پر اترنے والی شام میں... کچھ جزیات کو چھپا کر پلنگ کے سرہانے ایستادہ مور اور اس میں جڑے سات آئینوں کے بارے میں بتایا..

"وہاٹ؟" اس نے خاور کا بازو جیسے ایک آہنی شکنجے میں جکڑ لیا.. اس کی گرفت اتنی کڑی تھی کہ اسے درد کو سہارنے کے لیے دانت بھینچنے پڑے.. "یہ تم کیا کہہ رہے ہو.."

اس کا یہ رد عمل بہت اچانک تھا اور خاور خوفزدہ ہو گیا "ایسی کوئی بات نہیں ہوئی.."

"ہاں اسی لیے تم اگلے روز اسلام آباد واپس آنے کی بجائے تین دن وہیں ٹھہرے رہے تھے.. میں ایئرپورٹ پر جاتی رہی تھی.." وہ ایک مختلف عورت ہو چکی تھی.. بے قابو اور پاگل پن کے آس پاس "اسی لیے.. اس کوٹھڑی کی چابی تو میرے پاس تھی جس کے اندر میں نے تمہیں سنبھال رکھا تھا اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہارے ساتھ میں نے اس کٹیا کو بھی بند کر دیا ہے.." اس نے ہینڈ بیگ کھول کر دو کیپسیول کانپتے تھرتھراتے ہاتھوں سے پتے کو چیر کر نکالے اور پانی کے بغیر نگل گئی۔ "ڈو یو ہیو سیکس ود ہر؟"

"اس عمر میں تو یہ مشکل ہو جاتا ہے۔" خاور نے اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے بمشکل ہنس کر کہا..

"مجھے بتاؤ.. ڈڈیو؟"

"نہیں.."

"پلیز پلیز.. مجھے بتادو... ڈڈیو؟.." اور اس کی آنکھوں میں جھڑیاں لگ گئیں.. اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا.. اور وہ گردن کے راستے بہہ کر اس کے گریبان کے اندر سرائت کرتے ہوئے اس کی قمیض کو گیلا کرنے لگے..

"نہیں..."

"تمہاری آواز میں یقین نہیں ہے.." وہ ہسٹریائی ہو گئی "میں نہیں برداشت کر سکتی .. تم مرزا صاحب جیسے نہیں ہو سکتے لیکن میں جانتی ہوں کہ چراگاہ ابھی ویران نہیں ہوئی.. گھاس کے تنکے ابھی ہیں.. وہ نیلے سویٹر میں ابھی تک الجھے ہوئے ہیں.. میں جانتی ہوں.."

"میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے اس سے پیشتر کہ بارہ کہو کے ہر گھر میں تمہاری چیختی ہوئی آواز پہنچ جائے اور لوگ یہاں تک آجائیں یہ جاننے کے لئے کہ یہ پاگل عورت کون ہے.. اور اگر تم کار میں نہیں بیٹھو گی تو میں آسانی سے پیدل نیچے اتر سکتا ہوں اور اپنے گھر تک جا سکتا ہوں۔"

وہ جس یک لخت گی سے ہسٹریائی ہوئی تھی.. ایک ہی پل میں سیڑھیاں پھلانگتی عرش تک جا پہنچی تھی اُسی بے محابہ رفتار سے اگلے پل میں نیچے آگئی "آئی ایم سوری.. پاگل خانہ تو ایسا ہی ہوتا ہے.."

"کار میں بیٹھو.."

"بیٹھتی ہوں" وہ ایک بے دام غلام کی طرح دروازہ کھول کر ڈرائیور کی نشست پر بیٹھ گئی..

وہ آنسو پونچھتی ہوئی سراسر نارمل ہو گئی۔

کار نیچے اتر کر سملی روڈ پر دائیں جانب مڑی تو وہ ایک سکول گرل کی طرح ہنستی ہوئی چلبلاہٹ کے ساتھ کہنے لگی "پی ایچ ڈی ان انتھروپولوجی.. ہاں.. مجھ سے شرط لگالو وہ پینتالیس برس سے کم نہیں ہے.. موٹی اور بد شکل ہے اور عینک لگاتی ہے... از دیٹ اے بیٹ؟"

پورے سات روز کے بعد.. وہ پھر لائن پر تھی.."

"کیا یہ ممکن ہے؟.."

"جی.."

"کہاں؟"

"جہاں آپ پسند کریں.."

"میں پھر بتادوں کہ یہ صرف موت ہے جو مجھے الجھا رہی ہے.. تو کہیں بھی.. جہاں ہم اطمینان سے بیٹھ کر تھوڑی دیر باتیں کر سکیں.. یہ آپ پر منحصر ہے کہ کہاں.. میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔"

اسلام آباد کی ڈھکی ہوئی.. کورڈ مارکیٹ کے باہر فٹ پاتھ کے کنارے خاور نے قیصر سے مستعار شدہ سفید گاڑی بمشکل پارک کی.. وہ صبح سویرے ڈیوٹی پر جانے سے پیشتر اس سے ملنے آگیا تھا.. وہ آج کی ملاقات اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی ذاتی کار ورکشاپ میں کھلی پڑی تھی اور وہ اس الجھن میں تھا کہ کیا یہاں سے مری روڈ تک ایک سوزوکی ویگن میں جانا اور پھر وہاں سے ٹیکسی حاصل کر کے کورڈ مارکیٹ تک پہنچنا.. صرف اس لئے کہ وہاں کوئی خاتون موت کے سیاہ نظریات دامن میں سمیٹے اس کی منتظر ہے.. اتنے تردد کے لائق ہے؟ چنانچہ اس نے اپنے اس مڈل ایجڈ پلے بوائے دوست کو نہ چاہتے ہوئے بھی موجودہ صورت حال بیان کر دی "یار مجھے بھی ایک ڈیوٹی پر پہنچنا ہے.. کسی معنگ اور موٹی ادھیڑ عمر عورت سے ملاقات کرنی ہے.. تو تم اتنی دیر یہاں آرام سے بیٹھو.. تمہیں چائے بنا کر دیتا ہوں اور میں ایک گھنٹے کے اندر اندر اسے بھگتا کر واپس آتا ہوں.."

"شاہ جی.. یہ میں کیا سن رہا ہوں.. آپ کی زندگی میں ایک عورت.."

قیصر اگر یہ سوچتا تھا کہ وہ فارغ ہو چکا ہے.. بنجر ہو چکا ہے.. اور چراگاہ میں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں ہے تو اسے الزام نہیں دیا جا سکتا تھا.. خاور اگر اسے غلافی آنکھوں اور عابدہ کے بارے میں بتاتا تو وہ قطعی طور پر یقین نہ کرتا.. چہ جائیکہ ایک اور عورت..

"نہیں نہیں.. ایک کاروباری قسم کی مختصر سی اپائنٹ منٹ ہے یار.."

"بسم اللہ.." قیصر نے اپنی جادو بھری مسکراہٹ جو صنف نازک کے لئے سراسر مرگ تھی اس پر نچھاور کرتے ہوئے کار کی چابی اسے تھما دی "کچھ کر کے آنا شاہ جی.. خالی نہ آ

جانا" وہ مسکراہٹ سے ہنسی میں آگیا.. اور پھر اس وارڈروب کی جانب چلا گیا جس میں گندے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے وہ جانتا تھا کہ اس کے لئے وقت گذارنے کے لئے کوئی نہ کوئی امرت دھارا موجود ہوگا..

کورڈ مارکیٹ کے باہر سرما کی دھوپ میں ٹاکلوں کے فٹ پاتھ پر افغانی ہینڈی کرافٹس سجی ہوئی تھیں.. مزار شریف کے آئینے.. بدخشاں کی پرانی صراحیاں.. کنگن.. جھمکے.. جڑاؤ ہار.. چاندی کی پازیبیں.. قیمتی پتھر.. انگوٹھیاں.. روسی سپاہیوں کی سمور کی ٹوپیاں جن پر ابھی تک ریڈ سٹار جڑے ہوئے تھے.. غالیچے اور سموار.. لیکن یہ سب کے سب اس ثقافت کی نمائندگی کرتے تھے جو کابل سے دور.. دریائے آمو کے کناروں کی تھی.. اور ان نوادرات پر ڈپلومیٹک انکلیو سے آنے والی غیر ملکی خواتین جھکی تھیں اور بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں۔

کورڈ مارکیٹ کے داخلے کے دروازے کے برابر میں ایک بیزار سا شخص پکوڑے تل رہا تھا اور گاہک بڑے تحمل سے اپنی باری کے منتظر تھے۔

اس ڈھکی ہوئی مارکیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک سکون اور ٹھہراؤ سا آجاتا ہے اور باہر پھیلے کنکریٹ کے کیپٹل سٹی کا وجود تحلیل ہو جاتا ہے۔

دائیں جانب.. مارکیٹ کے اندر جانے پر اس پارسی جنٹل مین کا سٹور تھا جہاں سے آپ کل دنیا کی اشیائے خورد و نوش حاصل کر سکتے تھے... تازہ سوس پنیر.. بنکاک کی ٹونا فش.. امریکہ میں بھری ہوئی مشروبات کے ٹن... ہسپانوی زیتون سرکے میں بھگوئے ہوئے.. ہائنز کی انگلش بینز اور سوپ.. اٹالین سپاگیٹی... اور جرمن ساسیج... پاکستان کے علاوہ وہاں ہر قومیت کی خوراک شیلفوں پر سجی تھی..

یہ پارسی سٹور کورڈ مارکیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر تھا اور بائیں جانب ایک خرانٹ اور کھچڑے گول ٹوپی پہنے دکاندار کے شیشے کے شوکیس اور کاؤنٹر تھے جو اُن کے عقب میں کھڑا ابھی نماز سے فارغ ہو کر آیا تھا یا اگلی نماز پر جانے کی تیاری میں تھا ہمیشہ اسے دیکھ کر کہتا "آیئے خاور صاحب.. چائے تو پیو گے.. بسکٹ تو کھاؤ گے.." اور وہ اس انداز میں یہ دعوت دیتا کہ مہربانی کرو میں تو یونہی پوچھ رہا ہوں.. قبول نہ کر لینا..

اس خرانٹ دکاندار کے کاؤنٹر کے قریب اس نے اسے وقت دیا تھا..

"میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟"

وہ ششدر رہ گیا تھا..

"آپ نے مجھے ٹیلی ویژن پر تو دیکھا ہو گا؟"

"نہیں.. میں بہت عرصے سے امریکہ میں تھی.. یہاں آکر بھی مجھے ٹیلی ویژن دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تو میں آپ کو کیسے پہچانوں گی.."

"میں..." اس نے کوشش کی کہ اپنا حلیہ بیان کر سکے.. "بہر حال... آپ فلاں کاؤنٹر کے پاس آجائیں تو..."

"میں اپنے بارے میں بتا دیتی ہوں.. میں اپنا لباس بہت زیادہ تبدیل نہیں کرتی۔ میرے پاس صرف دو تین جوڑے ہیں.. آئی مین پاکستانی.. ابھی میں اجرک کا ایک کرتہ شلوار پہنے ہوئے ہوں' سفید ناگے کے جوگرز کے ساتھ.. آئی ہوپ کے آپ مجھے پہچان جائیں گے۔"

یہ پہلی بار تھا کہ وہ کورڈ مارکیٹ کے ٹھہراؤ میں داخل ہوا تھا اور اس کے پاس خریداری کی کوئی فہرست نہ تھی.. پارسی کے سٹور کے باہر وہ ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے پارسی کی نظر اس تک آجاتی تو وہ فوراً نہایت خوشدلی سے اسے خوش آمدید کہتا اور وہ یہاں یوں بے مقصد دیکھا نہیں جانا چاہتا تھا... اس نے بہت بے آرام اور مجرم سا محسوس کیا جیسے مارکیٹ میں داخل ہونے والا ہر شخص صرف اسے ہی شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے.. تھوڑی دیر کے بعد اس نے فرانٹ دکاندار کے شوکیسوں کی جانب نگاہ کی تو وہاں بہت لوگ تھے.. بچے اونی ٹوپیاں ٹرائی کرتے ہوئے.. جرابوں کی قیمتوں پر عورتیں جھگڑتی ہوئی اور کم از کم ایک مرد جو ایک انڈرویئر کو آنکھوں کے سامنے لا کر اس کے الاسٹک کو کھینچ کر اس کے اور اپنے سائز کا اندازہ لگا رہا تھا.. بہت سے لوگ تھے.. اور ان کے درمیان میں ایک لڑکی کی پشت دکھائی دے رہی تھی.. باب کٹ نیم سنہری بال اجرک کے کرتے کی قربت میں آکر مختصر ہوتے جھولتے ہوئے اور ان میں سے کسی ایک لمحے میں سفید گردن کی ایک جھلک... اور پاؤں میں سفید جوگر... وہ ابھی جھجک میں تھا کہ اسی لمحے وہ شوکیس سے نظریں ہٹا کر پلٹی۔ اس کی آنکھیں متلاشی تھیں لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ ایک خلا میں دیکھتی تھی' اسے پہچانتی نہیں تھی.. وقت کی اس مختصر کترن میں اگر وہ وہی تھی۔ خاور نے

صرف اس کی نیلی آنکھوں کو دیکھا' جو بے راہرو' آوارہ اور خانہ بدوش تھیں' کہیں صحراؤں اور ویرانوں میں مقیم تھیں۔ بے لگام اور وحشی تھیں.. اور ایک مرتبہ آنکھیں جھپکنے کے تیز اور مختصر ترین وقفے میں خاور کی غیر جانبداری بے اثر ہو گئی...

عابدہ سومرو اور غلافی آنکھوں نے کبھی اُس کے پورے وجود پر یُوں دھاوا نہیں بولا تھا..

اور اس لمحے اس نے اپنے آپ سے کہا... ابھی وقت ہے.. تم فرار ہو جاؤ.. بچ نکلو.. کہ زندگی میں پہلی بار تم نیلاہٹ کے اس جال میں الجھ سکتے ہو.. خطرے کا سرخ نشان جل بجھ رہا ہے تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ ابھی وقت ہے..

نیلی متلاشی آنکھیں کورڈ مارکیٹ میں داخل ہونے والے ہر شخص کو پرکھ رہی تھیں..

شاید یہ وہ نہ ہو.. اس میں ابھی تک جھجک تھی جب وہ آگے ہوا.. "ڈاکٹر سلطانہ؟"

اس کی خالی آنکھیں یکدم بھر گئیں.. "یس آئی ایم.."

ایک نازک ملوک سی لڑکی جس کی نیلگوں آنکھیں اس کے سراپے کی جانب جانے ہی نہ دیتی تھیں جیسے سومنات مندر کے بُت کے ماتھے میں جڑا زمرد اس بُت کی ہیئت کو اپنی جگمگاہٹ سے چندھیا کر نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے..

"میرا خیال ہے آپ مجھے جانتی ہیں..."

"ہاں..." اس نے گردن ٹیڑھی کر کے سر جھٹکا تو باب کٹ بال بھی حرکت میں آگئے اور ان کی نیم سنہری چلمن میں سے اس کے ایک کان اور گردن کی جھلک آئی.. کہیں کہیں کوئی ایک آدھ بال سفید بھی تھا.. "میں یہاں بہت بے آرام محسوس کر رہی تھی.. شکر ہے کہ آپ وقت پر آگئے.."

"جی بالکل..." وہ بالکل ایک ٹین ایجر کی طرح نروس ہو گیا اور مخمصے میں پڑ گیا کہ اب کیا کیا جائے..

"کیا ہم یہیں کھڑے رہیں گے؟.. اس کا بدن دبلا اور سیدھا تھا اور اس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس پر زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں سمجھتی..

"آپ کہاں جانا پسند کریں گی؟.. وہ اس خیال سے آیا تھا کہ کورڈ مارکیٹ کے برابر میں بازار روڈ کے ساتھ جو اوپن ایئر ریستوران ہے وہاں کچھ وقت گزار کر اسے بھگتا دیا جائے

گا.. لیکن وہ بھگتانے والی شکل کی نہیں تھی.. وہ غلافی آنکھوں کے بیان کردہ سراپے سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی تھی..

"جہاں ہم باتیں کر سکیں.. اطمینان کے ساتھ.."

دامن کوہ سے آگے بل کھاتی سڑک جب ہموار ہو کر پیر سہاوا تک پہنچتی تھی تو وہاں وے سائیڈ چائے خانوں میں بہت ہجوم تھا..

کچی سڑک پر اترتے ہوئے وہ اجنبی کار کے گیئرز سے الجھتا رہا لیکن ہمہ وقت اسے برابر کی نشست پر براجمان کسی وجود کا نہیں بلکہ نیلاہٹ میں ڈوبتی آوارہ خانہ بدوش آنکھوں کے ایک گہرے سمندر کے موجزن ہونے کا احساس ہوتا تھا جو اس کو اپنے اندر ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتا تھا..

ایک کرن چمکی تھی.. ایک رمق بیدار ہوئی تھی... پاگل خانے اور عابدہ میں یہ رمق کہیں نہ تھی اور وہ لاتعلق رہا تھا جذبات کی سطح پر... لیکن غیب سے یہ نیل کرائیاں نیلکاں جو تن من کو نیلو نیل کر رہی تھیں آنکھیں نازل ہو گئی تھیں اور ایک پرائی کار میں اس کے برابر میں پرسکون بیٹھی تھیں اور نہیں جانتی تھیں کہ عقبی آئینے سے جھولتا موتیے کا بوسیدہ اور زوال پذیر ہار جس شخص کی ناک کو کبھی چھو لیتا ہے تو وہ شخص اس کی مانند بوسیدگی اور زوال کا شکار ہے اور اس کے باوجود اس کی حیاتی میں پہلی بار ایک رمق بیدار ہوئی تھی.. اس کی ویران چراگاہ میں گھاس کے تنکے پھوٹتے تھے..

"مجھے تم میں دلچسپی نہیں' موت میں ہے.. کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟"

"میں اس کی کوئی ایسی توجیح تو نہیں کر سکتا چند فقروں میں جو اسے بیان کر دے.. آج تک کوئی بیان کر پایا ہے جو میں کر سکوں.. میں اس کے بارے میں کبھی بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتا اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جنہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی وہ یا تو حواس کھو بیٹھے یا تارک الدنیا ہو گئے.. بیشتر مذاہب کی بنیاد ہی موت کا خوف ہے.. لیکن میں یہ جانتا ہوں ہر شے کی کشش چاہے وہ ایک منظر ہو یا شکل ہو فنا میں پنہاں ہے.. منظر میں یہی فنا کشش بھرتی ہے کہ میں نہ ہوں گا اور یہ سب کچھ ہو گا... اور

شکل تو خود فنا ہے اس کے وجود کا عناصر میں تحلیل ہو جانے کا ڈر ہی اسے حسن دیتا ہے.."

"نہیں.. یہ خیال ہے اور میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں.. کہ موت کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے؟"

"ایک لکھنے والا حساب کا سوال حل نہیں کر سکتا.. کوئی ایک درست جواب نہیں دے سکتا جو اسے پورے کے پورے نمبر دے دے.. میرا خیال ہے کہ میں وہ شخص نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے.."

"آپ کی ہر تحریر میں موت ہے اور میں طویل حوالے دے سکتی ہوں۔"

"یہ بالکل الگ بات ہے اگرچہ میں آپ کے ٹیلی فون سے پیشتر اس امر سے آگاہ نہیں تھا... میری تحریر کے پس منظر میں اگر موت کے سائے ہوتے ہیں تو میں انہیں خود جان بوجھ کر تخلیق نہیں کرتا۔ وہ اس تحریر اور اسے لکھنے والے کی بالآخر فنا کا پیغام ہوتا ہے جو خود بخود... بھیجنے والے کی خواہش کا تابع ہوتا ہے.."

"اگر میں ایک مثال دوں تو آپ اسے سن لیں گے؟"

"میں اتنے تردد سے آپ کو کورڈ مارکیٹ سے یہاں... اس ندی کی الگ تھلگ تنہائی میں لایا ہوں.. تو صرف اس لیے کہ بقول آپ کے.. ہم باتیں کر سکیں.. تو آپ باتیں کریں۔"

اگرچہ وہ یہ کہتے ہوئے مسکرایا تھا کہ شاید یوں گفتگو کا موضوع بدل جائے.. وہ کوئی اور بات کرے.. اپنے بارے میں.. اس سے کچھ پوچھے کچھ سنے.. لیکن اس نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں ندی کے بہاؤ پر نظریں جمائے بیٹھی رہی.. وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا.. ایک کاروباری ملاقات میں تو آنکھوں کی نیلاہٹ یا ان کی خانہ بدوش بے راہروی زیر بحث نہیں آسکتے.. یہ محض ایک بزنس میٹنگ تھی.. اور ایجنڈے پر صرف ایک ہی آئٹم تھی... موت!

وہ ٹانگیں سمیٹے.. ان کے گرد بازو حمائل کیے.. جیسے پوجی اپنی پگڑی کو ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر مزے سے بیٹھ جاتے تھے.. گھٹنوں پر سر رکھے اس کی موجودگی سے کسی حد تک لاتعلق پانیوں کو دیکھتی ہوئی اور یقیناً انہیں مزید نیلا کرتی ہوئی بولنے لگی "وہ ایک چمکیلا تیز روشنی والا دن تھا.. میں جس چہرے، جس درخت کو دیکھتی تھی تو وہ نکھرا ہوا لگتا تھا اور میں اسے

چوم سکتی تھی۔ میں اتنی خوش تھی کہ میں خود اپنے آپ کو دیکھتی تھی تو وہ نکھرا ہوا لگتا تھا اور میں اسے چوم سکتی تھی۔ میں اتنی خوش تھی کہ میں خود اپنے آپ کو پھول دینا چاہتی تھی.. میں نے ایک فلاور شاپ کے اندر جا کر اپنا پرس کاؤنٹر پر اُلٹا دیا اور فلارسٹ سے کہا کہ جتنی بھی رقم ہے مجھے اس کے پھول دے دو.. اور وہ ایک بہت ہی بڑا اور ناقابل یقین رنگوں والا بُوکے تھا اور اتنا بڑا تھا کہ دور سے میں نظر نہیں آتی تھی وہ بُوکے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا نظر آتا تھا۔ اور میں خوش تھی.. اور اس لمحے اگر کوئی گداگر بھی مجھ سے مخاطب ہو کر صرف "ہیلو" کہہ دیتا تو میں وہ بُوکے اسے پیش کر دیتی میں اتنی خوش تھی۔ میں اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی اٹھائیسویں منزل پر لفٹ میں سے بُوکے جھلاتی سیٹیاں بجاتی نکلی اور اپنے فلیٹ کے دروازے میں چابی گھمادی.. امریکہ میں اپنے ذاتی فلیٹ میں داخل ہونا یکدم ایک ہول سے ایک خوف سے دوچار ہونا ہوتا ہے کیونکہ آپ باہر کی گہما گہمی اور زندگی کے شور کی قوت میں سے یکدم الگ ہو جاتے ہیں اور فلیٹ کے اندر ایک خاموش کھا جانے والی ویرانی کا راج ہوتا ہے.. لیکن آج میں اس ویرانی کا بھی سامنا کر سکتی تھی.. میں نے ابھی چابی پوری طرح نہیں گھمائی تھی کہ مجھے فلیٹ کے اندر مسلسل بجتی ٹیلی فون کی گھنٹی کی مدھم سی آواز سنائی دینے لگی.. میں نے تالہ کھلتے ہی دروازے کو کندھے سے دھکیلا اور بھاگ کر رسیور اٹھالیا..

میری ماں تھی..

میں نے اپنی ماں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ مجھے خواہ مخواہ فون نہ کیا کرے.. صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ بیٹی تم کیسی ہو.. کب واپس آرہی ہو.. کھانا کھا چکی ہو یا نہیں.. میرے دیئے ہوئے قرآن کا کوئی ورق پڑھا ہے کہ نہیں.. اس قسم کی بے مقصد باتوں کے لیے مجھے فون نہ کیا کرے.. اور اس نے ایک عرصے سے ایسا نہیں کیا تھا.. تو اس کی آواز سن کر ایک ابال سا اٹھا.. تشویش کا ایک مرغولا سا گھومنے لگا کہ میری ماں نے اگر فون کیا ہے تو کچھ ہوا ہے..

"ظفر مر گیا ہے.." لاچار بھرائی ہوئی آواز میں اس نے صرف اتنا کہا..

ایک فلمی منظر کی طرح رسیور میرے ہاتھ سے گر گیا.. اور جو بُوکے میں نے کسی کے لیے بھی نہیں خریدا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر بکھر گیا... میں بھی شاید مر گئی تھی اس لیے کہ میں ظفر سے محبت کرتی تھی..

اگرچہ اس کی شادی میری چھوٹی بہن سے ہو رہی تھی لیکن.. میں تھی جو اس کے ساتھ محبت میں مبتلا تھی اور ظاہر نہیں کرتی تھی..

تمہیں تو پتہ ہے کہ مشرقی اقدار میں اپنی محبت کی قربانی دینا اور چُپ رہنا کتنا قابل تحسین اور عظیم فعل ہے.. اگرچہ میں مشرقی اقدار کی کوئی ایسی پابند بھی نہ تھی۔

مجھے اپنے باپ کی سائیکل ابھی تک یاد ہے.. اس کے ہینڈل پر لگی گھنٹی کو بار بار بجانا میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہوتی تھی.. وہ گھنٹی گویا کسی جادو سے بھری تھی جو میرے ننھے منے ہاتھ کی جانب شعاعیں بھیجتی تھی کہ میرے قریب آؤ.. تمہارا انگوٹھا بہت منا سا ہے اور نرم ہے اور تمہیں بہت زور لگانا پڑے گا اس دروازے کو کھولنے کے لیے لیکن سنو میں تمہیں ایک بات بتاؤں کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور جونہی تم اپنا انگوٹھا مجھ پر جماؤ گی تو تمہیں زور لگا کر دھکیلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی میں خود بخود تمہیں جادوئی موسیقی سنانے لگوں گی... اور میں ڈرتی ڈرتی لطف سے لرزتی اپنے باپ کی جانب کن اکھیوں سے دیکھتی اور اس کے چہرے پر "شاباش بیٹی.. بجاؤ" کی مسکراہٹ ہوتی اور میں اپنا انگوٹھا گھنٹی پر رکھ دیتی۔ اور واقعی وہ اپنے وعدے کے مطابق صرف میرے لمس سے ٹنن ٹنن بجنے لگتی... بعد کی زندگی میں.. جب میں امریکہ میں تھی.. جب کبھی میں نے گزشتہ زندگی کے بندھے ہوئے ساکت اقدار کو توڑا.. الکوہل کا جو بھی گھونٹ بھرا... کسی مرد کے ساتھ آشنائی کا پہلا قدم اٹھایا تو وہ گھنٹی کہیں نہ کہیں سے ٹنن ٹنن کرتی میرے کانوں تک آجاتی تھی اور پھر ان کے پردے اپنے لیے بند پا کر لوٹ جاتی تھی.. میں سنتی تھی اور اَن سنی کر دیتی تھی..

اپنے باپ کو.. بابا کو.. جب میں نے سوچا' سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے سر جھکا کر ہمارے کچے مکان کے چھوٹے سے دروازے میں سے داخل ہوتے ہوئے سوچا! میں کبھی انہیں اس سائیکل سے الگ نہ کر سکی.. نہ کبھی صرف ان کا چہرہ میرے ذہن میں آیا نہ کبھی وہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے' سکول رجسٹر پر گئی رات جھکے ہوئے' پہلی تاریخ کو ناکافی تنخواہ کو بار بار گنتے ہوئے' ماتھے پر معاشی تنگی کی سلوٹیں لئے ہوئے میں نے کبھی انہیں نہ دیکھا۔ بعد کی زندگی میں وہ ہمیشہ سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ دھرے اپنی پرانی عینک درست کرتے میری جانب دیکھتے تھے۔

ان کی سائیکل بہت آراستہ پیراستہ ہوتی تھی.. تم کہہ سکتے ہو کہ فلی لوڈڈ ہوا کرتی

تھی۔ ایئر پمپ اور ڈینمو لائٹ کے ساتھ 'پچھلا ٹائر جتنی تیزی سے گھومتا لائٹ اتنی ہی تیز اور روشن ہوتی تھی... پچھلے مڈگارڈ پر سرخ اور زرد گول گول ریفلیکٹر لائٹس.. ہینڈل پر ایستادہ پلاسٹک کے پھولوں کا چپ گلدستہ جس پر دھول جمی ہوتی تھی.. اس کے آگے بید کی آف وہائٹ نازک سی ٹوکری جو ہمیشہ ڈھلکی رہتی... وہ اتنی نازک تھی کہ بابا اس میں بہت کم کوئی چیز رکھتے کہ کہیں اسکے وزن سے وہ مزید نہ ڈھلک جائے۔ خراب نہ ہو جائے.. ہینڈل بار میں طرح طرح کے چوکور اور بیضوی آئینے کسے ہوتے تھے.. گھنٹی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے میں اپنے چہرے کی مسرت اور بے پایاں لطف کو انہی آئینوں میں دیکھتی تھی.. ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے وہ پورے پانچ روپے الگ کرتے... اپنے گھسے ہوئے تلووں والے شوز کے لیے نہیں اور نہ ہی ایک نئی عینک کے لیے بلکہ سائیکل کی آرائش کے لیے... وہ اس روز سکول سے لوٹتے تو ان کا چہرہ دمک رہا ہوتا.. وہ گھر میں داخل ہو کر گدی کو گرفت میں لیکر سائیکل کو ذرا اوپر اٹھاتے اور دائیں پاؤں سے پچھلے ٹائر کے درمیان میں معلق سٹینڈ پر بوجھ ڈال کر اسے نیچے کر کے سائیکل کو کھڑا کر دیتے.. اور پھر میری جانب تکنے لگتے' پُر اشتیاق اور داد طلب نگاہوں سے صرف میری طرف دیکھتے کہ صرف میں تھی جو ان کی ہمراز تھی.. میں نہایت سنجیدہ اور پُر تحقیق چہرہ بنائے سائیکل کی ایک ایک چیز کو نظر سے گزارتی جاتی اور پھر یکدم کسی ایسے پلاسٹک کے پھول' سٹکر یا آئینے پر ٹھہر جاتی جو پہلے وہاں نہیں تھا اور میں شرارت سے بابا کو دیکھتی اور ان کا چہرہ اس تشویش سے بھر جاتا کہ کہیں میں نے ان کی پانچ روپے سے حاصل کردہ تازہ ترین آرائش مس تو نہیں کر دی.. اور جب میں کھلکھلا کر ہنس دیتی تو ان کی جان میں جان آتی اور پھر ہم دونوں باپ بیٹی دیر تک اس نئے پھول یا سٹکر یا آئینے کو ایک انمول خزانے سے کہیں بڑھ کر محبت اور چاؤ سے دیکھتے رہتے...

میری ماں' ایک غصیلی طبیعت کی عورت.. معاشی مسائل نہ بھی ہوتے تو بھی وہ اسی طبیعت کی ہوتی.. بابا اور میرے اس مشترکہ سائیکل افیئر کو سخت ناپسندیدگی سے دیکھتی اور جانے کیا بڑبڑاتی رہتی..

اتوار کے روز چھٹی ہوتی اور وہ مجھے اٹھا کر سائیکل کے آگے درمیانی راڈ پر نصب ایک چھوٹی سی گدی پر بٹھاتے جو انہوں نے صرف میرے لیے وہاں لگوائی تھی۔ ایک پرانے دستر خوان میں تین روٹیاں' اچار کی پھانکیں اور دو ابلے ہوئے انڈے باندھ کر انہیں اپنی

لاڈلی بید کی ٹوکری میں رکھتے اور ہم دونوں سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی سرخوشی میں مست اور لہکتے ہوئے.. اوڈک جانے والی سڑک پر راونہ ہو جاتے.. بابا پر جوش انداز میں پیڈل مارتے ذرا آگے جھک کر کوئی قصہ کہانی شروع کر دیتے.. جب ان کا خلجی خانہ بدوش باپ انہیں دیئے کی روشنی میں کتابوں اور کاپیوں پر مسلسل جھکا دیکھتا تھا اور اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کا یہ بیٹا اونٹوں اور خیموں کی بجائے کاغذوں میں کیوں گم ہوتا ہے.. یا جب وہ میٹرک میں پاس ہوئے تھے تو ان کے قبیلے والے یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ انہیں جشن کرنا چاہیے یا سوگوار ہونا چاہیے.. اور جب انہیں شہر میں ملازمت ملی تھی اور انہوں نے ایک شہری لڑکی اس کی ماں سے شادی کر لی تھی.. اور جس روز میں پیدا ہوئی تھی تو چلتن کی پہاڑیوں کے رنگ کیسے گلابی ہو گئے تھے.. اور بابا اس کہانی میں اپنی طرف سے تب تک اضافہ کرتے چلے جاتے جب تک کہ سڑک حنا جھیل کو دائیں ہاتھ پر فراموش کرتی ہوئی اوڈک کے سیبوں کے گھنے باغوں کے اندر تک نہ چلی جاتی..

اور پھر ان میں سے کوئی ایک باغ ہوتا جو ماموں فقیر اللہ نے اس برس ٹھیکے پر لیا ہوتا اور وہیں.. ظفر ہوتا۔

وہ درختوں کی جڑوں کو ایک دوسرے سے ملاتی برفانی پانیوں کی نالیوں میں سے ریت نکالتا' ان کے راستے میں مٹی کے ڈھیر حائل کرتا ان کے رخ ایسے بدلتا کہ وہ باغ کے آخری درخت کو بھی سیراب کریں.. چھینٹے اڑاتا ظفر ہوتا..

وہ تقریباً میرا ہم عمر تھا۔

مجھے شلوار کے اوپر اس کے سفید ننگے بدن کا ایک ایک رواں اور بل یاد ہے..

ابھی شاہانہ پیدا نہیں ہوئی تھی..

باغوں کے اندر پکے ہوئے سیبوں اور پانیوں کے بہنے کی جو ٹھنڈی مہک ٹھہری ہوتی تھی.. اس نے امریکہ میں بھی میرا پیچھا کیا..

بابا کی سائیکل کی گھنٹی نے.. ظفر کی شلوار کے اوپر جو اس کا سفید بدن تھا اور سیبوں کے رس نے اور انہیں رس بھرا بنانے والے پانیوں کی مہک نے امریکہ میں مجھے ایک مجرم کی شرمندگی سے دوچار رکھا..

پہلا اتوار تھا جب میں چھٹی جماعت میں گئی تھی۔ میں بستر میں لیٹی بابا کی گھنٹی کی

منتظر رہی.. کب اس کی ٹنن ٹنن کی آواز آئے اور میں چھلانگ لگا کر چارپائی سے اتروں اور تیار ہونے لگوں..

مجھے چھلانگ لگا کر اپنے بستر سے باہر آنا تھا.. منہ ہاتھ دھونا تھا.. تین روٹیاں اچار کی پھانکیں ابلے ہوئے دو انڈے ایک دستر خوان میں بندھے بید کی ٹوکری میں.. اور ٹنن ٹنن اوڑک جانے والی سڑک.. جس کے آخر میں سیبوں کے بوجھ سے کبڑے ہونے والے درخت اور ان کے نیچے نالیوں میں چھینٹے اڑاتے ظفر کو ہونا تھا..

میں نے انتظار کیا.. ماں گہری گھوک نیند میں تھی اور بابا کروٹیں بدل رہے تھے "بابا دیر نہیں ہو گئی؟"

"آج نہیں جانا بیٹی.." عجیب دکھ ان کی آواز کو بٹھاتا تھا..

"لیکن کیوں بابا.. آپ بیمار ہیں؟"

"نہیں.."

"تو پھر کیوں نہیں جانا بابا.."

"تم اب بڑی ہو گئی ہو.." انہوں نے ایک اور کروٹ بدلی اور منہ پرے کر لیا..

ہمارے گھر کی کچی دیواریں اس اتوار کے بعد ذرا اونچی ہو گئیں.. اور ان کے آگے اور دیواریں وجود میں آ گئیں.. دروازے کے آگے ایک کھلا ویرانہ تھا اس پر بھی پردہ پڑ گیا.. ان کے پار جانے کی اجازت اب مجھے نہ تھی۔

ظفر دو چار ماہ بعد ماموں فقیر اللہ کے ہمراہ ہمارے گھر آتا.. لیکن اب اس کا گورا اور کومل سینہ ڈھکا ہوتا اور وہ چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا رہتا.. نظریں نیچی کئے جیسے اس کے پپوٹے پتھر کے ہو گئے ہوں اٹھ نہ سکتے ہوں.. میں اپنے آپ کو ماں کی ہدایت کے مطابق لپیٹ لپاٹ کر ایک مردے کی طرح ڈھکی ہوتی صرف ماموں کو سلام کرنے کے لئے کوٹھڑی میں سے باہر آتی اور پھر کھڑے کھڑے واپس چلی جاتی.. ذرا سی تاخیر ہوتی.. سلام کے بعد ذرا سا وقفہ آتا اور میں صرف ایک نظر سر جھکائے زمین کو گھورتے ظفر کو دیکھتی تو اسی لمحے شاہانہ کو گود میں سنبھالتی ماں کی غصیلی آواز آ جاتی "سلطانہ.." اور میں اندر چلی جاتی..

وہ دیواریں اور پردے ہر نئے دن کے ساتھ دبیز اور اندھے ہوتے گئے.. بابا مجھے خود سکول چھوڑنے جاتے اور چھٹی ہوتی تو ان کی بجی ہوئی سائیکل کے راڈ پر نصب چھوٹی سی